(غلام گردش)

اینگلوانڈین لوگ سماج کی خوشبو تھے!

1688 میں ایسٹ انڈیا کمپنی برصغیر میں قدم جمانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہندوستان میں روزگار کیلئے آنے والے برطانوی، پرتگالی اور دیگر یورپین قوموں کی یلغار تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی میں ہزاروں کی تعداد میں گورے فوجی موجود تھے۔ اسی اثناء میں کمپنی کے ڈائریکٹرز نے فیصلہ کیا کہ مغربی لوگ، مقامی خواتین سے شادی کر سکتے ہیں۔ فیصلہ غیر معمولی حیثیت کا حامل تھا۔ ڈائریکٹرز کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ اگلے سو یا دو سو سال بعد اسکے عملی مضمرات کیا ہونگے۔ اجازت ملنے کے بعد، لاتعداد انگریز ملازمین نے برصغیر میں شادیاں کرنی شروع کر دیں۔ اس سماجی اختلاط سے ایک نئی نسل وجود میں آئی، جو اینگلوانڈین (Angloindians) کہلاتے تھے۔ یہ لوگ حقیقت میں تو برصغیر رہتے تھے۔ مگر فکری طور پر برطانیہ سے منسلک تھے۔ تقسیم ہند کے وقت محتاط اندازے کے حساب سے انکی آبادی تیس لاکھ کے قریب تھی۔ پاکستان میں بھی ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے۔ یہ لوگ صرف اور صرف شہروں تک محدود تھے۔ اینگلوانڈین حد درجہ دلچسپ لوگ تھے۔ انکے محاورہ، روزمرہ کی زبان، اُٹھنے بیٹھنے کے طریقے، رہن سہن تمام کا تمام برطانوی اور مقامی روایات کا ایک منفرد سنگم تھا۔ ریلوے، ڈاکخانہ، کسٹم، نرسنگ، کان کنی اور دیگر شعبوں میں کثیر تعداد میں موجود تھے۔ چند محکمے جیسے ریلوے تو ایسے تھے جو عملی طور پر اینگلوانڈین ہی چلا رہے تھے۔ میڈیکل اور نرسنگ کے شعبے کا بھی یہی حال تھا۔ ڈی سوزا، سلویا، جیسے نام بالکل عام تھے۔ ان لوگوں نے تجارت کے شعبے میں بھی بہت اہمیت حاصل کر لی تھی۔ پرائیویٹ سیکرٹری، دفاتر کے مینیجر اور اسطرح کے شعبوں میں انکی کارکردگی بے مثال تھی۔ لاہور میں انڈس ہوٹل کے قرب میں زندگی سے بھرپور، ان لوگوں کی آبادی تھی۔ اسی طرح ریلوے سٹیشن کے نزدیک بھی اینگلوانڈین کثیر تعداد میں رہتے تھے۔ کراچی میں ایلنی سٹریٹ انہی کی نمائندگی کرتی تھی۔ یہ بہت زیادہ متمول لوگ نہیں تھے۔ سفید پوش طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ انکی سماجی روایات مقامی آبادی سے حد درجہ مختلف تھیں۔ مری میں سیم ہوٹل کے مالک بھی یہی لوگ تھے۔ برطانوی زندگی کے مطابق رقص، موسیقی، اور خوش رہنا انکے خمیر میں شامل تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ یہ مقامی لوگوں سے دور رہتے تھے۔ بالکل نہیں۔ انکے گھروں میں آمدورفت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ یہ خوش رہنے والے اور خوش رکھنے والے افراد تھے۔ حد درجہ صاف ستھرے اور مہمان نواز نسل۔

انکی طرزِ گفتگو بھی حد درجہ دلچسپ تھی۔ لندن کا صیغہ ہر وقت استعمال کرتے رہتے تھے۔ اگر آپ ان سے وقت پوچھیں، تو یہ لاہور کا وقت بتانے کے بعد ضرور کہتے کہ لندن میں کیا وقت ہوگا۔ انکی واضح اکثریت نے برطانیہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر اکثر استعارے لندن سے منسلک تھے۔ اگر لاہور کی بیکری سے ڈبل روٹی خریدی تو یہ ضرور کہتے تھے کہ ''بیک ہوم'' یعنی لندن میں ڈبل روٹی کس طرح کی ہوتی ہے۔ بیک ہوم انکی زبان پر اسطرح چڑھا ہوا تھا کہ جیسے یہ ساری زندگی برطانیہ میں گزار کر صرف چند گھنٹے پہلے یہاں پہنچے ہیں۔ مگر اصل میں یہ کبھی بھی وہاں نہیں گئے تھے۔ انکا لہجہ بھی حد درجہ منفرد تھا۔ انگریزی اور اُردو کا عجیب وغریب ملغوبہ۔ اگر کوئی، اینگلوانڈین دوست کے گھر جانا چاہتے تھا۔ تو یہ کہتے تھا کہ ''تم کتنے بجے ہمارے گھر آنا مانگتا''۔ کھانے کیلئے بھی فرماتے تھے کہ ''تم کب

کھانا کھانا مانگتا'' رنگ برنگے فقرے محفلوں کی جان ہوتے تھے۔کوئی انہیں بُرا نہیں سمجھتا تھا۔لاہور میں ایک اینگوانڈین ٹریفک انسپکٹر دہائیوں تک مال روڈ پر نظر آتا رہا۔ریلوے سٹیشن لاہور کے نزدیک ان لوگوں کا سماجی کلب بھی موجود تھا۔اس میں پڑھے لکھے مقامی لاہوری بھی خوب نظر آتے تھے۔یہ نسل دراصل پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں زندگی اور رنگ کی بھرپور علامت تھی۔کمال اَمر یہ بھی ہے کہ انکی اکثریت اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔خواندگی تقریباً نوے فیصد کے قریب تھی۔خواتین میں تعلیم حاصل کرنے کا رجحان مردوں سے بھی زیادہ تھا۔آج سے ایک سے دوصدیاں پہلے جب کہ برصغیر میں خواتین کا تعلیم حاصل کرنا کافی مشکل تھا۔اینگلوانڈین خواتین سکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں کثیر تعداد میں نظر آتی تھیں۔موسیقی سے انکا لگاؤ بھی واضح تھا۔پختہ عمر کے چند لوگوں کو شائد یاد ہو کہ مری کے سیم ہوٹل میں ایک بہت بڑا ڈانسنگ فلور تھا۔ویک اینڈز، کرسمس اور نئے سال کے موقعہ پر وہاں شاندار تقریبات منعقد کی جاتی تھیں۔ویسے اس زمانے میں پورے ملک میں قرینے کے ہر ہوٹل میں تقریبات کا سلسلہ پورا سال ہی جاری رہتا تھا۔لاہور میں انٹرکونٹینینٹل ہوٹل، فلیٹیز اور دیگر ہوٹلوں میں غیر ملکی طائفے موجود رہتے تھے۔شام کو مال روڈ اور ملحقہ سڑکیں رنگ ونور کی بارش میں نہاتی ہوئی تھیں۔

1977 کے الیکشن کے بعد، مذہبی اور دیگر جماعتوں کے الحاق نے بھٹو کو مجبور کر دیا کہ ''نائٹ کلب'' اور ''ممنوعہ چیزوں'' پر پابندی لگا دے۔تاریخ کا ظلم یہ بھی ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کا اپنی لگائی ہوئی پابندیوں سے بھی کوئی سروکار نہیں تھا۔جب ان سے اس معاملہ پر پوچھا گیا تو جواب تھا کہ یہ تمام پابندیاں تھوڑی مدت کیلئے ہیں۔یہ مستقل نہیں ہیں۔مگر اسکے بعد کے واقعات میں ہمارے مربی، جناب ضیاء الحق صاحب، مارشل لاء کی صورت میں نازل ہوئے اور انہوں نے پورے معاشرے کی سوشل انجینئرنگ شروع کر دی۔تنقیدی نگاہ سے دیکھا جائے تو ضیاء الحق کا یہ تمام کام اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کیلئے تھا۔مذہبی فرقہ پرستی، جذباتیت، تنگ نظری اور شدت پسندی کو حکومتی سطح پر سرپرستی حاصل ہوگئی۔ہمارا معاشرہ کا تو خیر اَبتر ہو ہی گیا۔مگر اینگلوانڈین آبادی بالکل مقید سی ہو کر رہ گئی۔آزادی انکے ہر خلیے میں رچی بسی ہوئی تھی۔انکی سماجی تحقیر شروع کر دی گئی۔ہمارے محبوب جنرل ضیاء الحق تو ایک مخصوص مذہبی فکری سوچ کے پیروکار تھے۔وہ تو مسلمانوں ہی کے دوسرے فرقوں کو اہمیت دینے کے قائل نہیں تھے۔تو یہ اینگلوانڈین کس کھیت کی مولی تھے۔نتیجہ وہی ہوا کہ یہ تمام نسل شدید عدم تحفظ کا شکار ہوگئی۔یہ بہت بڑی تعداد میں پاکستان سے ہجرت کر کے مغربی ممالک میں منتقل ہونے شروع ہوگئے۔برطانیہ، آسٹریلیا، امریکہ، کینیڈا انکے نئے مسکن ٹھہرے۔بڑی سرعت سے لاہور، کراچی اور دیگر بڑے شہران سے خالی ہوگئے۔ایک یا دو دہائیوں میں ہمارے شہروں میں انکا وجود ختم ہو گیا۔مگر ساتھ ہی ساتھ، یہ نسل، رونقِ بازار بھی ساتھ لے گئی۔طویل عرصے سے کم از کم لاہور میں طالبعلم کو اینگلوانڈین نظر نہیں آئے۔بالکل یہی حال پارسیوں کا بھی ہے۔وہ بھی بڑے شہروں میں موجود تھے۔پارسی بھی جان بچا کر مغربی ممالک میں منتقل ہو چکے ہیں۔شائد آپکو یقین نہ آئے۔پاکستان میں تین سے چار ہزار یہودی بھی موجود تھے۔مگر اب ان میں سے ایک بھی یہاں موجود نہیں ہے۔یہودیوں کی عبادت گاہ، فری میسن ہال، مال روڈ کے عین قلب میں واقع ہے۔واپڈا ہاؤس کے بالکل سامنے یہ آج بھی شہر کی بہترین عمارت ہے۔تیس برس پہلے وزیراعلیٰ کا دفتر قرار دیدیا گیا ہے۔پورا ایک برس وزیراعلیٰ کے ڈپٹی سیکرٹری کی حیثیت سے وہاں بیٹھا رہا ہوں۔دعوے سے عرض کرونگا کہ یہ بلڈنگ اندر سے اس قدر خوبصورت ہے کہ عقل

حیران رہ جاتی ہے۔ چوبی دروازے، لکڑی کے فرش، شیشوں کی کھڑکیاں اس قدر جانبِ نظر ہیں کہ طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ کوئی بھی یہ ذکر نہیں کرتا کہ یہ دراصل یہودیوں کی عبادت گاہ تھی۔ ویسے ہمارا اقلیتوں کے ساتھ سلوک کسی صورت میں بھی قابل فخر نہیں رہا۔ مگر یہ کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم کسی اور مذہب کے پیروکاروں کو عزت اور حفاظت دینے کی استطاعت ہی نہیں رکھتے۔ دکھ ہوتا ہے یہ سب کچھ دیکھ کر۔ مگر اس سے ہمارے گناہوں کی تلافی تو نہیں ہو سکتی۔

اینگلوانڈین لوگوں کی طرف واپس آتا ہوں۔ ان میں حیرت انگیز صلاحیت کے لوگ شاد ہوئے ہیں۔ رڈیارڈ کپلنگ (Rudyard Kipling) انہی کرداروں میں سے ایک جیتا جاگتا انسان تھا۔ لاہور میں کپلنگ تیرہ برس قیام پذیر رہا۔ لاہور سے ایک اخبار نکلتا تھا۔ جسکا نام ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' تھا۔ اخبار کا دفتر مال روڈ پر تھا۔ کپلنگ تیرہ برس سے اس سے منسلک رہا۔ اسی عرصہ میں کپلنگ نے کہانیاں بھی لکھنا شروع کر دیں۔ سخت گرمی میں کپلنگ سوٹ اُتار کر بنیان اور نیکر پہن لیتا تھا اور اسکے قلم سے وہ شاہکار کہانیاں لکھی جاتیں تھیں، جو آج تک اَمر ہیں۔ اس لاہوری اینگلوانڈین کو 1907 میں ادب کا نوبل پرائز ملا۔ بالکل اسی طرح پرنس ولیم، ڈیوک آف کیمرج بھی والدہ کی طرف سے اسی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ عظیم صلاحیت والے لوگوں کی فہرست حد درجہ طویل ہے۔ برطانوی موسیقی کا بے تاج بادشاہ، سر کلف رچرڈ بھی اینگلوانڈین تھا۔ بین کنگزلے (Ben Kingsley) کا نام کون نہیں جانتا۔ ہالی وڈ کا ایک دمکتا ہوا ستارہ۔ لازوال فلموں میں کام کرنے والا بھی اینگلوانڈین تھا۔ اسکے والد رحمت اللہ بھانجی مسلمان تھے اور برصغیر میں گجرات سے تعلق رکھتے تھے۔ بین کنگزلے کو فلمی دنیا کا سب سے بڑا انعام یعنی اکیڈمی ایوارڈ بھی ملا تھا۔ لورا جونز بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتی تھی۔ مٹھی بھر لوگوں کی اس نسل نے اتنے بڑے بڑے لوگ پیدا کیے ہیں جنکا ذکر صرف ایک کالم میں نہیں ہو سکتا۔ کسی بھی نسل کا ملک سے ختم ہو جانا قطعاً قابل ستائش اَمر نہیں ہے۔ فرقہ واریت سے معمور ہم لوگوں کی زندگی، دوسرے فرقے کو مسلمان نہیں گردانتے تو یہ بیچارے اینگلوانڈین لوگ تو حد درجہ کمزور لوگ تھے۔ انکی اس معاشرے میں سانس لینے کی جگہ غیر حکیمانہ طریقے سے ختم کر دی گئی۔ پھر وہی ہو، جو اَزل سے ہوتا آ رہا ہے۔ اینگلوانڈین پاکستانی اپنی حفاظت کیلئے دیارِ غیر میں پناہ گزین ہو گئے۔ ملکی فضا سے خوشبو اور رنگ بھی شائد انہی کے ساتھ فضا میں معدوم ہو گیا!

راؤ منظر حیات